Version No.			

ROLL NUMBER						

Answer Sheet No.____________

Sign. of Candidate ___________

Sign. of Invigilator ___________

اردو(لازمی) برائے جماعت نہم (2nd Set Solution)

ماڈل سوالیہ پرچہ (کریکلم 2006ء)

حصہ اوّل (کل نمبر:15، وقت:20منٹ)

حصہ اول لازمی ہے۔ اس کے جوابات اسی صفحہ پر دے کر ناظم مرکز کے حوالے کریں۔ کاٹ کر دوبارہ لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ **لیڈ پنسل کا استعمال ممنوع ہے۔**

سوال نمبر1: ہر جزو کے سامنے دیے گئے درست دائرہ کو پر کریں۔

(1) جس جملے میں مسند الیہ اسم اور مسند فعل ہو ایسے جملے کو کیا کہا جاتا ہے؟

(A) جملہ اسمیہ ○ (B) جملہ انشائیہ ○

(C) جملہ فعلیہ ○ (D) جملہ شرطیہ ○

(2) "حرا ذہین ہے"۔ اس جملے میں حرا قواعد کی رو سے کیا ہے؟

(A) فاعل ○ (B) مسند ○

(C) فعل ○ (D) مبتدا ○

(3) "میرا بھائی" کس قسم کا مرکب ہے ؟

(A) مرکب ناقص ○ (B) مرکب تام ○

(C) مرکب توصیفی ○ (D) مرکب عطفی ○

(4) لفظ "بیت" ایک ذو معنی لفظ ہے۔ صحیح معانی کا انتخاب کیجیے۔

(A) گھر اور مکان ○ (B) گھر اور شعر ○

(C) شعر اور مصرع ○ (D) مصرع اور گھر ○

(5) وہ لفظ جو مجازی معنوں میں استعمال ہو اسے قواعد کے اعتبار سے کیا کہیں گے؟

(A) استعارہ ○ (B) روزمرہ ○

(C) تشبیہ ○ (D) کنایہ ○

(6) مبتدا، خبر اور فعل ناقص کس کے اجزا ہیں؟

(A) فعل مضارع ○ (B) جملہ فعلیہ ○

(C) فعل لازم ○ (D) جملہ اسمیہ ○

(7) کسی نوعیت کی تقریب کی کارروائی تحریر کرنے کو کیا کہا جاتا ہے؟

(A) رسید ◯ (B) درخواست ◯

(C) روداد ◯ (D) کہانی ◯

(8) ڈراما کی اصل یونانی لفظ "ڈراؤ" ہے اس کے کیا معنی ہیں؟

(A) شکلیں بنانا ◯ (B) کرکے دکھانا ◯

(C) خرابیاں دکھانا ◯ (D) نقلیں اتارنا ◯

(9) آس، ماس، گھاس جیسے الفاظ شعری اصطلاح میں کیا کہلائیں گے؟

(A) ردیف ◯ (B) قافیہ ◯

(C) ذو معنی الفاظ ◯ (D) محاورا ◯

(10) ایسی نظم جس کے ہر بند کے پانچ مصرعے ہوں، کیا کہلاتی ہے؟

(A) مثنوی ◯ (B) رباعی ◯

(C) قطعہ ◯ (D) مخمس ◯

(11) ایسی نظم جس کے ہر بند میں ٹیپ کا مصرع یا شعر بار بار دہرایا جاتا ہو، کیا کہلاتی ہے؟

(A) مخمس ◯ (B) مسدس ◯

(C) ترجیع بند ◯ (D) ترکیب بند ◯

(12) ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا اس شعر میں علم بیان کی کون سی قسم استعمال ہوئی ہے؟

(A) تشبیہ ◯ (B) استعارہ ◯

(C) مجاز مرسل ◯ (D) کنایہ ◯

(13) سوکھے ہوئے پتوں کو دیکھ کر ———— منھ کو آتا ہے۔

روزمرہ و محاورہ کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے درست لفظ کا انتخاب کر کے جملہ مکمل کیجیے۔

(A) معدہ ◯ (B) جگر ◯

(C) کلیجہ ◯ (D) دل ◯

(14) کس لفظ کے معنی مخفی اشارے یا خفیہ بات کے ہیں؟

(A) تشبیہ ◯ (B) استعارہ ◯

(C) مجاز مرسل ◯ (D) کنایہ ◯

(15) علی اچھا لڑکا ہے۔ اس جملے میں "ہے" قواعد کی رو سے کیا ہے؟

(A) فعل تام ◯ (B) فعل ناقص ◯

(C) فعل لازم ◯ (D) فعل متعدی ◯

جوابات:

(1)	(C)	(2)	(D)	(3)	(A)
(4)	(B)	(5)	(A)	(6)	(D)
(7)	(C)	(8)	(B)	(9)	(B)
(10)	(D)	(11)	(C)	(12)	(B)
(13)	(C)	(14)	(D)	(15)	(B)

فیڈرل بورڈ امتحان برائے جماعت نہم

اردو (لازمی) ماڈل سوالیہ پرچہ (کریکلم 2006)

وقت: 2:40 گھنٹے — کل نمبر: 60

نوٹ: حصہ دوم اور سوم میں دیے گئے سوالات کے جوابات علیحدہ سے مہیا کی گئی جوابی کاپی پر دیں۔ آپ کے جوابات صاف اور واضح ہونے چاہئیں۔

حصہ دوم (کل نمبر 34)

سوال نمبر 2: (الف) حصہ نثر:

درج ذیل عبارت کو غور سے پڑھیں اور نیچے دیے گئے سوالات میں سے آٹھ کے جوابات اپنے الفاظ میں لکھیں: (8 x 2 = 16)

مجالسِ صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے اور اس کا اظہار نہ کرتے، حضرت زینبؓ سے جب نکاح ہوا اور ولیمہ کی تو کچھ لوگ کھانا کھا کر وہیں بیٹھے رہے، اس وقت پردہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور حضرت زینبؓ بھی مجلس میں شریک تھیں، آپؐ چاہتے تھے کہ لوگ اٹھ جائیں لیکن زبان سے کچھ نہیں فرماتے تھے، لوگوں نے کچھ خیال نہ کیا، آپؐ اٹھ کر حضرت عائشہ کے حجرہ تک گئے، واپس آئے تو اسی طرح مجمع موجود تھا، پھر واپس چلے گئے اور دوبارہ تشریف لائے، پردہ کی آیت اسی موقع پر اتری۔

کسی کی کوئی بات بری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لے کر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے، بلکہ صیغۂ تعمیم کے ساتھ فرماتے تھے کہ لوگ ایسا کہتے ہیں، بعض لوگوں کی یہ عادت ہے، یہ طریقۂ ابہام اس لیے اختیار فرماتے تھے کہ شخص مخصوص کی ذلت نہ ہو، اور اس کے احساسِ غیرت میں کمی نہ آجائے۔

سوالات:

i. اس عبارت کا مرکزی خیال لکھیں۔

جواب: حضورؐ کی ذات مبارک ہر انسان کے لیے بہترین اُسوہ ہے۔ حضورؐ لوگوں کی ناگوار باتوں کو بھی درگزر فرماتے۔ جس طرح حضرت زینبؓ سے نکاح کے موقع پر اپنا ردِ عمل دیا۔ اگر کسی کی کوئی بری بات معلوم ہوتی تو اس کا عمومی اظہار فرماتے تاکہ متعلقہ شخص کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ پہنچے۔

ii. حضورؐ کن باتوں کو برداشت کرتے تھے؟

جواب: حضورؐ لوگوں کی اکثر ناگوار باتوں کو بھی برداشت کرتے تھے اور لوگوں کے سامنے اس کا اظہار بھی نہ فرماتے۔

iii. پردہ کا حکم کب ہوا؟

جواب: جس دن حضورؐ کا نکاح حضرت زینبؓ سے ہو رہا تھا اور لوگ برابر بیٹھے رہے۔ اسی موقع پر پردے کا حکم نازل ہُوا تھا۔

iv. مجلس میں لوگ کیوں جمع تھے؟

جواب: حضورؐ کا نکاح حضرت زینبؓ سے ہو رہا تھا اور لوگ ولیمہ کھانے کی غرض سے بیٹھے تھے۔

v. حضورؐ ابہام کا طریقہ کیوں اختیار فرمایا کرتے تھے؟

جواب: حضورؐ کسی کی برائی یا خامی کی نشاندہی فرماتے ہوئے ابہام کا طریقہ اپناتے تھے تاکہ اصلاح بھی ہو جائے اور متعلقہ شخص کی عزت نفس کو بھی ٹھیس نہ پہنچے۔

vi. عبارت کی روشنی میں بتائیں کہ پردہ کیوں ضروری ہے؟

جواب: پردہ اس لیے ضروری ہے کہ شرم وحیا کے تقاضے بھرپور طریقے سے پورے ہو سکیں اور ایک دوسرے کی عزت و وقار بھی برقرار رہے۔

vii. حضورؐ کسی کی ناگوار بات کو راز میں کیوں رکھتے تھے؟

جواب: حضورؐ کسی کی ناگوار بات کو راز میں اس لیے رکھتے تھے تاکہ مخصوص شخص کی ذلت نہ ہو اور اس کے احساسِ غیرت میں کمی نہ آجائے۔

viii. حجرہ سے کیا مراد ہے اور حضورؐ اٹھ کر کس کے حجرہ میں گئے تھے؟

جواب: حجرہ مبارک سے مراد کسی فرد کا مخصوص کمرا ہے۔ حضورؐ اُٹھ کر حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں تشریف لے گئے تھے۔

ix. حضورؐ نے خود لوگوں کو مجلس سے جانے کے لیے کیوں نہ کہا تھا؟

جواب: حضورؐ نے خود لوگوں کو مجلس سے جانے کے لیے اس لیے نہ کہا کہ لوگوں کو یہ بات ناگوار گزرے گی یا کسی کی دل آزاری نہ ہو جائے۔

(ب) حصہ شعر:

درج ذیل اشعار کو غور سے پڑھیں اور دیے گئے سوالات میں سے پانچ کے جوابات لکھیے: **(5 x 2 = 10)**

i. کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے　　دو گز زمیں نہ ملی کوئے یار میں

ii. ان کی نظر میں شوکت، جچتی نہیں کسی کی　　آنکھوں میں بس رہا ہے، جن کی جلال تیرا

iii. نہ گور سکندر، نہ ہے قبر دارا　　مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

iv. موت کا ایک دن معین ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

v. دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہو گئی　　پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کنجِ مزار میں

سوالات:

i. ان اشعار میں سے مقطع کی نشاندہی کر کے مقطع کی تعریف لکھیں۔

جواب: اِن اشعار میں یہ شعر مقطع ہے:

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے　　دو گز زمیں نہ ملی کوئے یار میں

مقطع: مقطع غزل کا آخری شعر ہوتا ہے جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔

ii. کن کی نظروں میں کسی کی شوکت نہیں جچتی؟

جواب: جن کی نظروں میں اللہ تعالیٰ کی ذات کا جلال بس رہا ہو اُن کی نظروں میں کسی کی شوکت نہیں جچتی۔

iii. تیسرے شعر میں کس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے؟

جواب: تیسرے شعر میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ سکندرِ اعظم اور دارا جیسے بادشاہوں کے نام و نشان بھی دنیا سے مٹ گئے جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے فانی ہے اور ہر شے نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

iv. شاعر کو نیند نہ آنے کی کیا وجوہات تھیں؟

جواب: شاعر کو نیند نہ آنے کی وجہ بظاہر کوئی نہیں ہے کیونکہ موت تو اپنے مقررہ وقت ہی پر آنی ہے۔

v. " دن زندگی کے ختم ہوئے شام ہو گئی" سے کیا مراد ہے؟

جواب: اس کا مطلب ہے کہ موت کا وقت قریب ہے۔

vi. کنجِ مزار سے کیا مراد ہے؟

جواب: موت کے بعد انسان قبر میں دفنا دیا جاتا ہے اور قبرستان میں کوئی تنگ بھی نہیں کرتا۔ اس لیے انسان ایک کونے میں مردہ حالت میں پڑا رہتا ہے۔

(ج) حصہ قواعد:

مندرجہ ذیل میں سے چار کے جوابات تحریر کریں: **(4 x 2 = 8)**

i. "سلمٰی نے سبق پڑھا۔" اس جملے کی ترکیب نحوی کریں۔

جواب: سلمٰی: فاعل　　نے: متعلق فاعل　　سبق: مفعول　　پڑھا: فعل

جملہ فعلیہ ہے۔

ii. "نازکی اس کے لب کی کیا کہیے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے" یہ شعر علم بیان کی کون سی مثال ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب: یہ شعر علم بیان کے حوالے سے تشبیہ کی مثال ہے کیونکہ لبوں کو گلاب کی پنکھڑی سے تشبیہ دی گئی ہے۔

iii. ایک مثال کی مدد سے ارکانِ استعارا کی نشاندہی کریں۔

جواب: ماں نے کہا: "چاند سو رہا ہے" اس مثال میں:

چاند: مستعار منہٗ ہے کیونکہ اس سے معنی اُدھار لیے گئے ہیں۔

بچہ: مستعار لہٗ ہے جس کے لیے معنی ادھار لیے گئے ہیں جبکہ

خوبصورتی: مشترک وصف

iv. جملہ اسمیہ اور جملہ فعلیہ میں فرق واضح کریں۔

جواب: جملہ اسمیہ میں مسند الیہ اور مسند دونوں اسم ہوتے ہیں جبکہ جملہ فعلیہ میں مسند الیہ اسم جبکہ مسند فعل ہوتا ہے۔ مثلاً

پاکستان میرا ملک ہے۔ جملہ اسمیہ

پاکستان نے میچ جیتا۔ جملہ فعلیہ

v. غزل اور نظم میں فرق واضح کریں۔

جواب: نظم ایسی صنف سخن ہے جس کے تمام اشعار ایک ہی موضوع یا مرکزی خیال کے حامل ہوتے ہیں جبکہ غزل کا ہر شعر الگ اکائی ہوتا ہے یعنی الگ موضوع اور مرکزی خیال کا حامل ہوتا ہے۔

حصہ سوّم (کل نمبر 26)

سوال نمبر 3: مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک عبارت کی تشریح کریں: (5)

الف۔ مراسلے کی شکل میں کچھ لکھنے کی ذمہ داری اخبار پر عائد نہیں ہوتی بلکہ وہ انفرادی رائے یا نظریہ تصور ہوتا ہے۔ رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ بہر حال جب ایک مراسلے کی صورت میں کوئی نئی بات کہی جاتی ہے تو اس کو جواب جوابی مراسلے میں دیا جاتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ اس نئی بات یا نظریے پر بحث شروع ہو جاتی ہے اور عام قارئین بھی بحث کی حد تک اسے ذہنی طور پر قبول کر لیتے ہیں۔ ابلاغ عامہ کی اصطلاح میں اس عمل کو تقطیری اثر کہا جاتا ہے۔ فرسودہ روایات کو ختم کرنا پتھر کو توڑنے کے برابر ہوتا ہے، اس لیے کامیاب اور مؤثر ابلاغ کا طریقہ یہ ہے کہ نئے خیالات و نظریات کو دھارے کی صورت میں یک دم منظر عام پر لانے کے بجائے قطرہ قطرہ ٹپکایا جائے۔ جس طرح پانی کے قطرے مسلسل گرتے رہنے سے پتھر میں سوراخ ہو جاتا ہے، اسی طرح نئے افکار بھی آہستہ آہستہ پرانے خیالات کے پتھر کو توڑ ڈالتے ہیں۔

جواب: تشریح:

اس پیراگراف میں مصنف نے مکتوب نگاری خاص طور پر صحافتی مکتوب نگاری کے حوالے سے وضاحت کی ہے کہ مدیر کے نام لکھے گئے خطوط میں مختلف مسائل کے متعلق بات ہو سکتی ہے۔ اور ساری دنیا میں مدیر کے نام لکھے گئے خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مدیر کے نام لکھے گئے خطوط میں مقامی مسائل سے لے کر عالمی مسائل تک پر اپنی ذاتی رائے لکھ کر بھیجی جاتی ہے۔

مکتوب نگار جو کچھ مدیر کے نام لکھتا ہے اُس کی نوک پلک سنوارنے کے علاوہ ادارتی ٹیم کچھ ترمیم یا اضافہ نہیں کیا کرتی۔ صحافت اور بالخصوص اخبارات کے شعبہ میں مدیر کے نام لکھے گئے خطوط اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ اِن میں اخبارات کی پالیسی پر بھی بات کی جاتی ہے۔ انھی خطوط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کون سا اخبار عوام میں کس حد تک کس انداز میں مقبول ہے۔ خبروں کی صحت اور غیر جانبداری ہی کسی اخبار کو اپنی قاری کی نظر میں وقیع اور معتبر بناتی ہے۔ اسی لیے قارئین کے خطوط کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جن سے یہ واضح ہوتا رہتا ہے کہ اخبار کی سمت کیا ہے؟ مختلف اداروں کی ناقص کارکردگی پر بھی بے لاگ تبصرے کیے جاتے ہیں لیکن ان تمام آرا سے اخبار کی ادارتی ٹیم کا متفق ہونا ضروری نہیں ہوتا۔

بعض اوقات کسی مسئلے کی نشاندہی کے سلسلے میں شائع شدہ ایک مراسلے کے جواب میں کوئی دوسرا مراسلہ اخبار کی زینت بن جاتا ہے اور پھر جواب در جواب کی صورت میں ایک نئی بحث جنم لے لیتی ہے۔ اور قارئین کی فکری اور ذہنی تربیت بھی ہوتی رہتی ہے۔ اِس طرح نئے افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت میں بھی اخبارات اپنا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔ یوں جہاں فرسودہ اقدار و روایات اپنی موت آپ مرتی چلی جاتی ہیں اور زندگی نئے آفاق سے روشناس ہوتی چلی جاتی ہے ۔

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں

ب۔ اسی طرح میرے مقدمہ باز دوست ہیں۔ جنہیں اپنی ریاست کے جھگڑوں، اپنے فریق مخالف کی برائیوں اور جج صاحب کی تعریف یا مذمت کے (تعریف اس حالت میں جب کہ انہوں نے مقدمہ جیتا ہو) اور کوئی مضمون نہیں۔ من جملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے، میں محمد شاکر خان صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا کیونکہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں۔ شاکر خان صاحب موضع سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر کے نہایت معزز آدمی ہیں۔ انہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں، جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا۔ ان کا خیال ہے کہ اہل علم کی تھوڑی سی قدر کرنا، امرا کے شایان شان ہے۔ ایک مرتبہ میرے یہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے یہ کہہ کے۔

"شہر میں رات دن شور و شغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصہ رہنے سے تبدیل آب و ہوا بھی ہو گی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کو سکو گے۔ میں نے ایک کمرہ خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا ہے جس میں پڑھنے لکھنے کا سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دن رہ کے چلے آنا۔ دیکھو میری خوشی کرو"۔

جواب: تشریح:

اس پیراگراف میں مصنف نے ہمارے ایک اہم معاشرتی رویے کو موضوع بنایا ہے کہ بے شک ہم مشرقی عوام میں بہت زیادہ رکھ رکھاؤ اور رشتوں ناطوں پہ توجہ دیتے، ان کا خیال رکھتے اور نبھاتے بھی ہیں۔ لیکن اس شدتِ اخلاص کا دوسروں پر کیا اثر ہوتا ہے اس کی ہمیں چنداں پروا نہیں ہوتی اور نہ ہی ہم پروا کرنے کی کوئی شعوری کوشش بھی کرتے ہیں۔ مصنف دلی کے چاندنی چوک والے فقیر کی تقریر سُن کر اُس پہ اظہارِ افسوس نہیں کرتا اور نہ ہی مصنف کے دل میں ہمدردی کا کوئی احساس پیدا ہوتا ہے کہ اُس کا کوئی دوست نہیں اور غریب الوطن ہے اس کی بجائے مصنف اپنی ذات سے اُس کا موازنہ کرتا ہے۔

ہمارے معاشرے کی قباحت یہ بھی ہے کہ جب ہم میں سے کوئی سماجی، علمی و ادبی اعتبار سے کسی مقام و مرتبہ پر پہنچتا ہے تو ہم جا و بے جا اُس کے ساتھ اپنا تعلق جتانے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسا کرنے میں یہ بھی خیال نہیں کرتے کہ ہماری وجہ سے کوئی کتنا تنگ ہو رہا ہے۔ مصنف کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اُس کے دوست احباب بھی اُسے نہ تو آرام کرنے دیتے ہیں اور نہ ہی لکھنے لکھانے کے لیے کوئی موقع دیتے ہیں۔ دوستوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی دوستی کے چکر میں رات گئے تک خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتے ہیں اور زبردستی دوسروں کو بھی بٹھائے رکھتے ہیں۔ غیر ضروری خطوط لکھتے ہیں اور پھر ضد اس پر ہوتی ہے کہ جوابات بھی دیے جائیں۔ مصنف بعد میں فقیر کے بارے میں سوچتا ہے اور خوش گمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے سے اُس کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ فقیر کو دوستوں کے نہ ہونے کا شکوہ کرنے کی بجائے خوش ہونا چاہیے کہ کوئی اسے راتوں کو محض لطیفے سنانے کے لیے جگاتا نہیں۔ جلسے جلوسوں میں آنے کی دعوتیں نہیں دیتا، خطوط کے جواب لکھنے کی ضد نہیں کرتا۔ اپنی بے کار اور ردی قسم کی تصانیف و تالیفات پہ تبصرے اور مضامین لکھنے کی فرمائش نہیں کرتا۔

سجاد حیدر یلدرم نے اپنے دوستوں کی اُن نادانیوں کو بیان کیا ہے جن کی وجہ سے وہ تنگ اور بے آرامی کی حالت و کیفیت کا شکار ہوتے ہیں۔ ہر دوست انھیں اپنی اپنی فطرت، عادت اور طریقے سے تنگ کرتا ہے اور اُن کے لکھنے لکھانے کے معمول میں نہ صرف خلل ڈالتا ہے بلکہ آمدہ خیالات کے تار و پود بھی بکھیر کر رکھ دیتا ہے۔ مصنف لاکھ کوشش کرتا ہے کہ دوستوں کو اپنے معاملات و معمولات سے دور رکھ کر کسی گوشے میں بیٹھ کر کچھ لکھ سکے۔ لیکن دوست چوں کہ انسان کے ہر پہلو اور عادت سے واقف ہوتے ہیں اور ہر دوست دوسرے دوست کی روزمرہ مصروفیات سے آگاہ ہوتا ہے اس لیے مصنف کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی ستم گری ہوتی ہے کہ جب اور جہاں کہیں وہ ہوتا ہے کوئی نہ کوئی دوست کسی نہ کسی طرح اُسے ڈھونڈ ہی نکالتا ہے اور اس کے وقت کو برباد کرتا ہے۔

شاکر خاں صاحب بھی مصنف کے ایسے دوستوں میں شامل ہیں جو ہمدردی اور نیکی کی نیت سے اُسے سلیم پور لے جانے کا کہتے ہیں کہ وہاں جا کر مصنف کو شہر کے شور شرابے اور دوسرے جھمیلوں سے نجات حاصل ہو اور وہ یک سوئی کے ساتھ ایک پر فضا ماحول اور آب و ہوا میں لکھنے پڑھنے کا کام کر سکیں۔ مصنف کو وہاں بہت ہی آرام دہ اور پُر سکون کمرے میں ٹھہرایا گیا جس کی کھڑکی سے نہایت ہی دل فریب منظر آنکھوں اور طبیعت کو تراوت بخشنے کا سامان کر رہا تھا اور ذہن و فکر خود ہی لکھنے کی طرف مائل ہوتی تھی۔

ایک ہی دن گزارنے کے بعد مصنف کو یہ احساس ہو گیا کہ سب کچھ مصنوعی اور بناوٹی ہے۔ قلم ایسے کہ نب کے بغیر، دوات میں روشنائی کا وجود تک نہ تھا۔ البتہ ایک بات تھی کہ بار بار مہمانوں اور ملاقاتیوں کا آنا جاری تھا اور اس تسلسل کے ساتھ کہ مصنف کو وہ یک سوئی اور سکون میسر نہ آ سکا جس کے باعث وہ اپنے خیالات اور سوچوں کو ایک جگہ مرتکز کر کے کچھ لکھ سکے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شاکر صاحب نے اپنے ملنے ملانے والوں میں مصنف کی اپنے ہاں آمد کا ڈھنڈورا پیٹ رکھا تھا۔ اب لوگ اشتیاق میں ایک نام ور لکھاری سے ملنے آ رہے تھے۔ پہلے راجا طالب علی صاحب کی آمد ہوئی پھر کوئی اور صاحب پھر کوئی اور صاحب۔ گویا مصنف شاکر خاں صاحب کے گھر کا ایک اعلیٰ نسل کا عربی گھوڑا تھے جسے وہ ہر ملاقاتی کو دکھا کر داد و تحسین وصول کر رہے تھے۔ آخر مصنف نے اس سب سے تنگ آ کر زور زبردستی ہی لکھنا شروع کر دیا۔

الغرض مصنف نے بین السطور اپنے دوستوں کا گلہ کیا ہے کہ وہ دوست کی عزت میں اضافے کا باعث بننے کی بجائے اس کی دلآزاری کا باعث بنتے ہیں اسی لیے وہ دعا اور مطالبہ کرتا ہے کہ اسے دوستوں سے بچایا جائے۔

سوال نمبر4: مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک نظمیہ جزو کی آسان لفظوں میں تشریح کریں: (5)

الف۔ اُمید نہیں جینے کی یاں صبح سے تاشام ہستی کو یہ سمجھو کہ ہے خورشید لبِ بام
یاں کام کروایسا م کہ جو آئے وہاں کام آجائے خدا جانیئے کب موت کا پیغام
اپنی نہ کوئی ملک نہ اَملاک سمجھنا ہونا ہے سبھی خاک، یہ سب خاک سمجھنا

جواب: تشریح:

شاعر نظم کے اِس بند میں دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کے عارضی پن کو بیان کر رہا ہے کہ ہم زندگی کے معاملات میں سُستی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ وقت ضائع کرتے ہیں اور جب زندگی کا سورج سفر کرتے کرتے ہمارے سروں پر آن موجود ہوتا ہے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم نے وقت کو ضائع نہیں کیا بلکہ حقیقت میں وقت نے ہمیں ضائع کر دیا۔ اس مرحلے پر سوائے کفِ افسوس ملنے کے ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا اور ہم اسی بات کی دہائی دیتے رہتے ہیں کہ

ے ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں ہر کام کرنے میں

اس لیے ہمیں یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ جانے کب ہماری موت کا پیغام آن پہنچے اور پھر دنیا کا مال و متاع دنیا ہی میں رہ جائے گا۔ سکندر اعظم جیسے لوگ بھی جب دنیا سے رخصت ہوئے تو خالی ہاتھ تھے۔ انسان اگر ساتھ لے کے جائے گا تو نیک اعمال۔ اس حقیقت کے باوجود ہم پرواہ نہیں کرتے۔ اس شعر کی عملی تصویر بن جاتے ہیں:

ے آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

دنیا کی حقیقت یہی ہے کہ انسان خالی ہاتھ آیا ہے اور خالی ہاتھ ہی دنیا سے لوٹ کر جانا ہے۔ اِس زندگی کے بعد کی زندگی میں صرف نیک اعمال ہی کام آئیں گے۔ ہمیں زندگی میں ہی آخرت کی تیاری کر لینی چاہیے۔

ب۔ ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو میری نَواؤں میں ہے، میرے جگر کا لہو
صحبتِ اہلِ صفا، نُور و حُضور و سُرور سرخوش و پُرسوز ہے، لالہ لبِ آبجُو
راہِ محبّت میں ہے، کون کسی کا رفیق ساتھ مرے رہ گئی، ایک مری آرزو

جواب: تشریح:

شاعرِ مشرق نے سات سو سال کے بعد مسجدِ قرطبہ میں داخل ہو کر باآوازِ بلند اذان دے کر دو رکعت نوافل ادا کیے تو ایسی رقت طاری ہوئی کہ گریہ و زاری کے عالم میں بے ہوش ہو گئے۔ یہ نظم اقبال کے اُسی مسجد قرطبہ میں داخلے کی کیفیات کا اظہار ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ میری تمام تر عبادات کا دارومدار میرے اخلاصِ نیت پر ہے۔ میں جو بات کہتا ہوں وہ دل کی گہرائیوں سے کہتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ اُسی بات میں اثر ہوتا ہے جو دل سے نکلتی ہے۔

انسان پر اپنی صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر عطار کی صحبت میں رہے اور کچھ نہ بھی خریدے تو اس کے لباس سے خوشبو تو آتی رہے گی۔ مٹی سے کسی نے پوچھا تم میں خوشبو کہاں سے آئی تو مٹی نے جواب دیا کہ میں پھولوں کی صحبت میں رہی ہوں۔ شاعر کہتے ہیں کہ نیک لوگوں کی صحبت بھی انسان کے لیے خیر و برکت کا باعث ہوا کرتی ہے۔ نیک، پارسا، متقی اور پرہیزگار لوگوں کی محفل میں اُٹھنے بیٹھنے سے انھی جیسا نور و حضور حاصل ہوتا ہے جس طرح ندی کے کنارے گل لالہ بھی سرسبز و شاداب رہتا ہے۔

محبت کے رستے پہ چلنے والے کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ راستہ اس نے اپنے زورِ بازو ہی پہ طے کرنا ہے۔ اس راستے میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ کیونکہ عشقِ حقیقی کے رستے میں نفسا نفسی کا عالم ہوتا ہے۔ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوتی ہے کسی دوسرے کی سمت توجہ دینے کی فرصت ہی کسی کو حاصل نہیں ہوا کرتی۔ بس ایک آرزو اور خواہش ہوتی ہے جو اس رستے کے مسافر کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے:

ے مصیبت بھی راحت فزا ہو گئی ہے تیری آرزو رہنما ہو گئی ہے
یہ وہ راستہ ہے دیارِ وفا کا جہاں بادِ صرصر، صبا ہو گئی ہے

سوال نمبر5: درج ذیل کسی ایک غزلیہ جزو کی تشریح کریں: (5)

الف۔ لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں
بُلبل کو باغباں سے نہ صیّاد سے گلہ قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں

جواب: **شعر نمبر1 کی تشریح:**

شاعر کہتے ہیں کہ اِس تباہ و برباد دنیا میں میرا دل نہیں لگتا۔ انسانی تاریخ میں ایک میں ہی نہیں ہوں بلکہ عارضی اور فانی دنیا سے کسی کی بھی نہیں بنتی۔ آخری مغل شہنشاہ، بہادر شاہ ظفر کا دور حکومت سر زمین ہندوستان کے لیے مصیبت و ابتلا، زوال و محکومی سے عبارت تھا۔ ہستے بستے خوش حال شہر احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ درانی مرہٹوں اور پھر انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں ویران اور کھنڈر بن گئے۔ ایسے میں مغل بادشاہ جس کسمپرسی اور بے بسی کا شکار تھا اُس کی عکاس یہ پوری غزل ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ دنیا اور اس دنیا کی زندگی عارضی ہے۔ ہمیں اس کی بجائے بعد از موت کی زندگی پر توجہ دینی چاہیے۔ وہ دنیا تو زیادہ جائے عبرت ہے جو تباہی اور بربادی کا منظر پیش کر رہی ہو۔ اُجڑا دیار، دِلّی شہر کو بالخصوص اور پورے ہندوستان کو بالعموم، کہا گیا ہے۔ الغرض دنیا ایک عارضی ٹھکانہ ہے اور جو بھی اس دنیا میں آیا ہے اُس نے کوچ کرنا ہے۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے اعمال پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ اعمال ہی سدا رہنے والی چیز ہے۔ باقی ہر شے مٹی میں مل کر مٹی ہو جائے گی۔

ے نے گُل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار   کس بات پر چمن، ہوسِ رنگ و بو کریں

بلاشبہ اُس دور میں دِلّی نے وہ سانحات دیکھے جن کی وجہ سے روح تک کانپ اُٹھے۔

ے دل کی بستی پرانی دِلی ہے   جو بھی گزرا، اس نے لُوٹا ہے

شعر نمبر2 کی تشریح:

بلبل کو مالی اور شکاری سے کوئی گِلہ شکوہ نہیں۔ اس لیے کہ بہار کے موسم میں قید لکھی تھی یہ بھی قسمت کا کھیل ہے اور قسمت سے لڑنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

بہادر شاہ ظفر کو اس کے دورِ حکمرانی ہی میں انگریزوں نے گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا۔ زندگی کے آخری دِن نہایت ابتلا میں گزارنے کے بعد بہادر شاہ ظفر کا انتقال بھی وہیں رنگون میں ہوا۔ جلاوطنی کی اس بے چارگی اور موت کے باوجود، شاعر کسی بات کا شکوہ نہیں کرتا۔ نہ ہی اپنی شکست کا دوش ہندوستان کی سپاہ یا عوام کو دیتا ہے کہ جنھوں نے بادشاہ کی حفاظت نہ کی۔ خود کو بلبل، انگریز کو صیاد، ہندوستانی عوام اور سپاہ کو باغباں کہہ کر اس بات پر صبر شکر کر لیتا ہے کہ جو تکالیف اور غم قسمت میں لکھے ہوں ان سے کسی طرح بھی فرار اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ فصلِ بہار سے مراد دورِ بادشاہی ہے۔ یعنی بہادر شاہ ظفر کہتے ہیں کہ میری زندگی جس طرح کی مصیبت زدہ ہے اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں، یہ سب میری قسمت میں لکھا تھا اور قسمت سے لڑنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

انگریزوں نے دِلّی پر قبضے کے بعد تباہی اور بربادی پھیلا دی۔ عوام تو دُور کی بات شہزادے شہزادیاں خواری کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے

ے دِلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں   تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

ب۔ میں بھی منھ میں زبان رکھتا ہوں   کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ہم کو اُن سے، وفا کی ہے اُمید   جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

جواب: **شعر نمبر1 کی تشریح:**

مرزا غالب محبت میں اس عقیدے کے قائل ہیں کہ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔ یہی وجہ ہے کہ دل میں احساسات و جذبات اور خیالات کا ایک دریا موجزن ہونے کے باوجود خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے کیونکہ ابھی گفتگو کرنے کی اجازت نہیں ملی۔ وہ اسی بات کا تو اظہار کر رہے ہیں کہ مجھے بھی بولنے کی اجازت دی جائے تاکہ میں اپنا مدعا مقصد بیان کر سکوں۔ سرِ محفل اگر میں نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے تو اس کا ہر گز ہر گز یہ مطلب نہیں کہ میں بولنے کی قوت سے محروم ہوں یا مجھے عرضِ مطلب کرنا نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں آدابِ محفل سے آگاہ ہوں کہ یہاں اجازت کے بغیر بات کرنا بھی مناسب نہیں۔

ے ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں   ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ویسے بھی عام طور پر ادب آداب کے سلیقے کو ملحوظِ خاطر تو رکھنا ہی چاہیے۔ یہ الگ بات کہ جب اجازت مل جائے تو پھر جی بھر کے جی کا غبار ہلکا کرنا چاہیے۔

شعر نمبر2 کی تشریح:

شاعر نے اپنی شاعری میں انسانی نفسیات کو بھی بیان کیا ہے۔ عشق اور محبت اصل میں یک طرفہ معاملہ ہی ہوا کرتا ہے۔ عشق میں حاصل حصول یا ہار جیت کی کوئی اہمیت نہیں ہوا کرتی۔ وفا اگر اس شرط پر کی جائے کہ بدلے میں بھی وفا ملے گی تو یہ اخلاص نہ ہوا، وفاداری نہ ہوئی بلکہ لین دین ہو گیا۔ محبت میں کسی قسم کے صلے کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

ے یہ گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

اس شعر میں شاعر کہتے ہیں ہماری سادہ دلی دیکھو کہ ہم نے ان سے وفا کی امید لگا رکھی ہے جنھیں وفا کے بارے میں علم ہی نہیں کہ وفا کہتے کسے ہیں۔ یہ ہماری سادہ دلی اور اخلاص کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ حقیقت جاننے کے باوجود بھی ہم نے وفا کی اور وفا ہی کی امید بھی رکھی۔

ے تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

اور بقول میر تقی میرؔ:

جبیں سجدہ کرتے ہی کرتے گئی حقِ بندگی ہم ادا کر چلے

سوال نمبر6: ایک پرانے کوٹ کی آپ بیتی لکھیں۔ (6)

جواب: ایک پرانے کوٹ کی آپ بیتی:

ارے رے رے۔۔۔۔۔ صاحب ٹھہریے! مجھے اس کوڑے کے ڈھیر پر پھینکنے سے پہلے ذرا میری چند باتیں تو سنتے جانا۔ وہ تمھارے ہی ایک شاعر بھائی مرزا غالب فرما گئے ہیں کہ:

دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

لیکن صاحب! تم انسان لوگ کہاں عبرت پکڑتے ہو، اور نصیحت کی بات تو تمھیں ویسے ہی زہر لگتی ہے۔ اس کے باوجود چند ایک باتیں ہیں جو میں تمھارے گوش گزار کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

میں تمھیں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جس حالت میں تم مجھے دیکھ رہے ہو میں ہمیشہ ایسا نہیں تھا اور جیسا رویہ تمھارا میرے ساتھ ہے، پہلے مالک کا برتاؤ اس سے بالکل مختلف تھا۔ لیکن تم انسان لوگ ہو نا۔۔۔۔۔ تم طوطے، گرگٹ اور موسم کو آنکھیں، رنگ اور مزاج بدلنے کے بر ملا طعنے دیتے ہو لیکن خود ان سب سے زیادہ بے وفا ہو۔

اب میری ہی مثال لے لو۔ چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ جب تمھارا ہی ایک بھائی بند جو ظاہری چال ڈھال سے کوئی ڈاکٹر معلوم پڑتا تھا، مجھے انار کلی کی ایک وسیع و عریض دکان سے خوشی خوشی خرید کر لایا تھا۔ اس وقت میں کپڑے کے ایک ٹکڑے کی شکل میں تھا اور اپنی اصل سے جدا ہونے پر رنجیدہ بھی تھا۔ لیکن اپنے خریدار و طلب گار کی خوشی میں، میں نے اپنا غم بھلا دیا۔

میرے خریدار ڈاکٹر صاحب نے ایک آدھ گھنٹے بعد ہی مجھے مال روڈ کے ایک مشہور زمانہ درزی کے سپرد کر دیا۔ میں اس سے قبل کپڑے کی دکان والے حضرت کی شقی القلبی تو ملاحظہ کر چکا تھا۔ جس نے چند ٹکوں کے عوض میرے وجود کو دولخت کر دیا تھا۔ لیکن صاحب! اس ٹیلر ماسٹر، جو شکل سے خاصا ل معصوم نظر آتا تھا، نے سفاکی کی انتہا کر دی۔ پہلے تو اس نے ایک تیز دھار آلے (جسے وہ قینچی کا نام دیتے تھے) کی مدد سے میرے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ پھر ایک آہنی مشین کی برق رفتار سوئی کے ذریعے میرے جسم میں اتنے سوراخ کر ڈالے کہ مجھے بے اختیار اردو کے شاعر کا یہ شعر یاد آ گیا:

ے اس دل کے دریدہ دامن کو دیکھو تو سہی، سوچو تو سہی جس جھولی میں سو چھید ہوئے اس جھولی کا پھیلانا کیا

رہی سہی کسر اس لوہے کے شدید گرم ٹکڑے (استری) نے پوری کر دی جس کے ذریعے نہایت بے دردی سے میرے پورے وجود کو داغ دیا گیا۔

لیکن صاحب! ایک بات تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ اذیت کے ان مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد میرے رنگ روپ پر نکھار آ گیا۔ جب مجھے پلاسٹک کے ایک شفاف لفافے میں ڈال کر شیشے کے شوکیس میں لٹکایا گیا تو لوگ مجھے رک رک کر دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ بعض لوگوں کی آنکھیں تو مجھے دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں۔ میرے مالک نے جب مجھے پہلی بار اس حالت میں دیکھا تو اس کے تو پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ سچ پوچھیں یہ سب دیکھ کر تو میں نے بھی اپنے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کو فراموش کر دیا۔

میرے مالک ڈکٹر صاحب نے درزی میاں کو کچھ پیسے تھمانے کے بعد نہایت سینت سنبھال کے مجھے اپنی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور خوشی خوشی گھر لے گیا۔ گھر میں لے جا کر ایک خوبصورت الماری میں مجھے احتیاط سے لٹکا دیا گیا۔ الماری میں پڑے ہوئے دیگر کپڑوں کے مجھے دیکھ کر منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آن پہنچا، جس کے لیے مجھے خصوصی طور پر تیار کروایا گیا تھا۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ یہ دن اس نوجوان ڈاکٹر کی منگنی کا دن تھا۔ منگنی کی تقریب ایک ہوٹل میں تھی۔ لڑکی اور لڑکے والوں کے تقریباً تمام مہمانوں نے مجھے تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ حتیٰ کہ خود لڑکی نے بھی دبے لفظوں میں لڑکے سے زیادہ میری تعریف کر ڈالی۔ میں تو یہ سب کچھ دیکھ کر پھولے نہیں سماتا تھا۔

منگنی کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب نے میرے ساتھ اچھا برتاؤ جاری رکھا۔ وہ مجھے خاص خاص تقاریب میں پہن کے جاتے تھے اور واپسی پر احتیاط سے الماری میں رکھنا نہ بھولتے۔ ایک دن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ کھانے کی ایک محفل میں بے تکلف دوستوں کے ہلے گلے کی وجہ سے سالن کا ایک ڈونگہ میرے اوپر الٹ گیا۔

جس کا میرے مالک کو شدید رنج ہوا۔ اس نے اس داغ کو صاف کروانے کی کوششیں بھی بہت کیں۔ لیکن چکنائی کے کچھ دھبے اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئے، جس سے میری قدر و منزلت مالک کی نظروں میں کافی حد تک جاتی رہی۔ کئی دن کی ذہنی کشمکش کے بعد میرا مالک ایک دن لنڈے سے دو تین کوٹ اُٹھا لایا۔ وہ آئینے کے سامنے بار بار ان کوٹوں کو پہنتا اور دل ہی دل میں مزاحیہ شاعر انور مسعود کا یہ قطعہ دہراتا:

حد سے بڑھا ہوا وہ میرا شوق نمود تھا — لارنس پور سے بھی پورا نہ ہو سکا

میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا — عزت مجھے ملی ہے تو لنڈے کے سوٹ سے

پھر ایک ظلم اس نے یہ کیا کہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کے حوالے کر دیا جو ایک مقامی کالج کا طالب علم تھا۔ یہیں سے میری بدقسمتی کا آغاز ہوتا ہے۔ ان بھائی صاحب نے تو میرے ساتھ وہ وہ سلوک کیا کہ بتاتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے۔ وہ مجھے موٹر سائیکل، کرکٹ میچ، آوارہ گردی، حتیٰ کہ بارش میں پہننے سے بھی گریز نہ کرتا۔ اس کثرت استعمال نے تو میرا وہ حشر کر دیا کہ مجھ سے خود اپنی شکل نہ پہچانی جاتی۔ چھ مہینے کے ظالمانہ استعمال کے بعد بھائی صاحب نے مجھے اپنے گھریلو ملازم کے حوالے کر دیا۔

وہ ملازم آپ کو کیا بتاؤں کوئی پرلے درجے کا بدتمیز تھا۔ وہ نہ صرف مجھے پہن کر سو رہتا بلکہ کئی بار تو سالن والے ہاتھ بھی میرے ساتھ ہی صاف کر لیتا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ گھریلو ملازم بھی مجھ سے اکتا گیا۔ اور کل رات چپکے سے مجھے سڑک پر پھینک گیا، جہاں سے اٹھا کر آپ مجھے کوڑے کے ڈھیر پر پھینکنے لگے ہیں۔ آپ یقیناً اس حرکت سے باز تو نہیں آئیں گے لیکن ذرا چہرے کی ناگواریت تو دور کر لیجیے۔ کیونکہ سیانے کہتے ہیں کہ نفرت اور ناگواری سے اور کسی کا کچھ بگڑے نہ بگڑے، آپ کی اپنی شخصیت کو زنگ لگ جاتا ہے۔

سوال نمبر 7: موسم برسات کی آمد کے موقع پر گندا پانی کھڑا ہونے سے بیماریاں پھیلنے کے خطرے سے آگاہی کے لیے اخبار کے مدیر کے نام ایک تحریر لکھ کر بھیجیں۔ (5)

جواب: **اخبار کے مدیر کے نام تحریر:**

امتحانی کمرا

الف۔ب۔ج

6 مارچ 2022ء

محترم مدیر صاحب!

السلام علیکم!

آپ کے روزنامہ کی وساطت سے اپنے علاقے کے ایک اہم مسئلے کی طرف اربابِ اختیار کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے علاقے میں نئی سڑک اور چند نئی تعمیرات کے سلسلے میں کھدائی کی گئی تھی۔ ہماری بدقسمتی کہیے یا منصوبہ بندی کا فقدان کہ اگلے ہی دن بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس نے دو چار دن تک جاری رہنا ہے۔ گڑھوں میں نالیوں وغیرہ کا گندا پانی اکٹھا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ گرمیوں کے موسم کی آمد کے ساتھ ہی مکھیوں اور مچھروں کی یلغار بھی شروع ہو جاتی ہے۔ ان تمام حالات کے پیشِ نظر خطرہ ہے کہ گندے پانی کے جمع ہونے سے علاقے بھر میں بیماریاں نہ پھوٹ پڑیں۔ ہم اہلیان محلّہ آپ کے اخبار کے توسط سے متعلقہ محکموں کے افسران بالا سے گزارش کرتے ہیں کہ اس مسئلے کی طرف توجہ دیں اور گندے پانی کی نکاسی کا انتظام جلد از جلد کر دیں تاکہ عوام سکھ کا سانس لے سکے۔

والسلام

آپ کے شکر گزار

اہلیان محلّہ

ء۔ی۔ے

* * * * *